باب 4

میؔر کا عہد

دَورِ ایہام گوئی کے بعد ردِّعمل کی تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا جسے میؔر و مرزؔا کا دور کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ 'اردو شاعری کا سنہرا' دور ہے۔ اس زمانے میں سیاسی نظام کمزور پڑ رہا تھا۔ نادر شاہ کے حملے کے شدید اثرات نے زندگی کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کی یہ پرچھائیاں اس دور کی شاعری میں نمایاں ہیں۔

سوؔدا (1706/07-1780/81) : ان کا نام مرزا محمد رفیع تھا۔ ان کے والد شیخ محمد شفیع کابل سے بہ غرضِ تجارت ہندوستان آئے تھے۔ یہیں سوؔدا کی ولادت ہوئی۔ سودا کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی معاشی زندگی کا آغاز فوج میں ملازمت سے کیا۔ پھر اسے ترک کر کے مختلف امرا کے درباروں سے وابستگی اختیار کی۔ دہلی کی تباہی کے بعد سودا پہلے فرخ آباد پہنچے۔ پھر فیض آباد پہنچ کر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ آصف الدولہ نے جب اپنا دارالسلطنت لکھنؤ منتقل کیا تو سودا بھی ان کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

سودا کا اصل میدان قصیدہ ہے لیکن وہ اپنے عہد کے ممتاز غزل گو بھی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں بلند آہنگی اور نشاط و سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً چند شعر درج ذیل ہیں:

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

کیفیّتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوؔدا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

قصیدے میں سوؔدا کی قادرالکلامی کا اندازہ ان کے ان قصائد سے لگایا جا سکتا ہے جو مشکل زمینوں میں لکھے گئے ہیں۔ قدرتِ کلام اور مختلف علوم سے واقفیت کے سبب سودا کے قصیدے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ زورِ بیان، شوکتِ الفاظ، بلند آہنگی اور زبان پر بے پناہ قدرت اُن کے قصائد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان کے ہجویہ قصائد بھی قابلِ ذکر ہیں۔

سودا نے صنف مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان مثنویات میں بھی مدح اور ہجو کا پہلو غالب ہے۔

فنِ مرثیہ گوئی میں بھی سودا کے کارنامے قابل قدر ہیں۔ مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت کا استعمال بھی سب سے پہلے سوداؔ ہی نے کیا ہے۔

اثرؔ دہلوی (1720/35-1794/95) : ان کا نام سیّد محمد میر تھا۔ وہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی اور چہیتے مرید تھے۔ اثرؔ کی تربیت بھی دردؔ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بہت لگاؤ تھا۔ دردؔ کی طرح اثر بھی صاحبِ علم وفضل اور درویش صفت انسان تھے۔ خواجہ میر دردؔ کے بعد وہی ان کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ انھوں نے غزل کے مقابلے میں مثنوی میں زیادہ شہرت پائی۔ ان کی زبان سادہ اور پر تاثیر ہے۔

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہے دل تجھے اعتبار آتا ہے

کون سنتا ہے یاں کسو کی بات بس اثرؔ قِصّہ مختصر کیجیے

حال اپنا کسو سے کیا کہیے ایک دل تھا سو وہ بھی کھو بیٹھے

دردؔ دہلوی (1721–1785) : ان کا نام سید خواجہ میر تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے خواجہ بہاء الدین نقشبند اور ماں کی طرف سے سیّد عبدالقادر جیلانی سے سلسلۂ نسب رکھتے ہیں۔ درد کی پرورش مذہبی اور صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ انھوں نے عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی۔ وہ قرآن وحدیث کے علاوہ فقہ اور تصوف کے مسائل پر بھی نظر رکھتے تھے۔ دردؔ نے جوانی کے دور میں ہی درویشی اختیار کر لی تھی اور سلسلۂ نقشبندیہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ فکر وخیال یا سیرت وعمل کے اعتبار سے ان کی پوری زندگی پاکیزگی کی مثال تھی۔ وہ اخلاقی اعتبار سے بھی بڑی دل کش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے مزاج میں صبر وضبط، توکّل وقناعت پسندی شامل تھی۔

صوفیانہ شاعری میں دردؔ کا ایک ممتاز مقام ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں اس روایت کو سب سے زیادہ فروغ دیا اور فکری بنیاد فراہم کی۔ ان کی تصانیف میں فارسی اور اردو دیوان کے علاوہ 'علم الکتاب'، 'واردات'، 'اسرار الصلوٰۃ'، 'نالۂ درد'، 'آہِ سرد' اور 'درد دِل'، وغیرہ شامل ہیں۔ اردو دیوان میں تقریباً پندرہ سو اشعار ہیں۔ درد کے کلام میں سادگی اور روانی کے ساتھ پاکیزگی اور گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ چھوٹی بحروں میں انھوں نے عمدہ غزلیں کہی ہیں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وائے ناکامی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سوز (1721-1798/99) : ان کا نام سیّد محمد میر تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تلاشِ معاش میں دہلی سے فرخ آباد گئے۔ آخرِ عمر میں فیض آباد میں قیام رہا اور وہیں وفات پائی۔ سوز بھی سودا کے شاگردوں میں تھے۔ شروع میں ان کا تخلص میر تھا۔ بعد میں سوز تخلص اختیار کیا۔ میر سوز کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ وہ شگفتہ مزاج تھے۔ تواضع اور توکّل بھی ان کے مزاج کا حصّہ تھا۔ میر سوز کے کلام میں اگرچہ گہرائی نہیں لیکن زبان کا لطف بہت ہے۔ سوز کے کلام کو لکھنوی رنگ کا اوّلین نمونہ بھی کہا گیا ہے۔ ان کے کلام میں فارسیت برائے نام ہے۔ ان کی زبان روزمرّہ اور محاورے سے سجی ہوئی ہے۔

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یا رب رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا

ایک آفت سے تو مرمر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

یہ ٹھنڈی سانس ہر دم کس سے سیکھی کیا ہوا تم کو
بھلا ہم سے کہو تم طالبِ دیدار کس کے ہو

قائم (1722/25-1793/94) : ان کا نام محمد قیام الدین تھا۔ قائم چاند پور، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے مگر بچپن ہی سے اپنے بڑے بھائی منعم کے پاس دہلی میں رہے۔ تلاشِ معاش کے سلسلے سے دہلی کے علاوہ ٹانڈہ (ضلع بریلی) لکھنؤ اور رام پور میں بھی ان کا قیام رہا۔ آخر رامپور میں انھوں نے وفات پائی۔ وہ اپنے عہد کے ایک اہم اور ممتاز شاعر تھے۔ قائم کے ہاں بھی ہجونگاری میں شدّت کا پہلو غالب ہے۔ دردؔ اور سوداؔ ان کے استاد تھے۔ سودا کی طرح غزل، قصیدہ اور ہجو کے علاوہ انھوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ فارسی نثر میں ان کا تذکرہ 'مخزنِ نکات' بھی قابل ذکر ہے۔ ریختہ میں شعرگوئی کی روایت کے فروغ میں قائم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

میں وہ اسیرِ قفس ہوں کہ عمر بھر جس نے
نہ سیرِ باغ کی، نے رؤئے آشیاں دیکھا

قسمت تو دیکھ، ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دوُر اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

میرؔ (1723/24-1810) : ان کا نام میر محمد تقی تھا۔ میرؔ کی پیدائش اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ ابھی دس گیارہ برس کے تھے کہ اُن کے والد میر متقی کا انتقال ہو گیا۔ تلاشِ معاش کے لیے میرؔ کو کم عمری ہی میں دہلی آنا پڑا۔ ابتدا میں اپنے سوتیلے ماموں خان آرزوؔ کے یہاں قیام کیا۔ خان آرزوؔ کا شمار اُس وقت کے اہم اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ میرؔ نے اُن سے کافی استفادہ کیا۔

میرؔ نے دہلی کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ نادر شاہ کا حملہ زیادہ تباہ کُن ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ دہلی پر کئی بیرونی حملے ہوئے۔ ان حملوں نے دہلی کے امرا اور رؤسا کو ہلا کے رکھ دیا۔ بیشتر اہلِ کمال دہلی کی سکونت ترک کر کے دوسرے علاقوں کی طرف نکل گئے۔ لکھنؤ میں اُس وقت نواب آصف الدولہ اہلِ فن کی پذیرائی کر رہے تھے۔ اس وجہ سے لکھنؤ صاحبانِ کمال کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ میرؔ بھی نواب آصف الدولہ کی دعوت پر 1781 میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ زندگی کے بقیہ ایّام انھوں نے وہیں گزارے اور وہیں وفات پائی۔

میرؔ کی زبان سادہ، دلکش اور شگفتہ ہے۔ غزل ان کی پسندیدہ صنفِ سخن تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صنف کے اساتذہ میں وہ آج بھی سرفہرست ہیں۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے مثنویاں، مرثیے، قطعات، رباعیاں، مثلث، واسوخت، مخمس، مسدّس سبھی اصناف اور اسالیب میں اپنے آثار چھوڑے ہیں۔ اسی لیے اُنھیں 'خدائے سخن' کہا جاتا ہے۔ اردو کے چھے دیوان کے علاوہ ایک فارسی دیوان بھی ان سے یادگار ہے۔ فارسی نثر میں خودنوشت سوانح 'ذکرِ میر' اور تذکرہ 'نکات الشعرا' بھی اُن کی اہم تصانیف ہیں۔

میرؔ نے اپنی غزلوں میں آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔ زبان کی سادگی، صداقت، جذبات کی شدّت اور احساسات کی تصویر کشی ان کی غزلوں کی اہم خصوصیات ہیں۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ	نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے	پھول کھلے ہیں، پات ہرے ہیں، کم کم بادوباراں ہے
دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے	یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں	تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ	کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر
مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میؔر کیا دِوانے نے موت پائی ہے

یقیںؔ (1727-1755) : ان کا نام انعام اللہ خاں تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کی تربیت سے ان کے جوہر کھلے۔ ان کی غزل میں دہلی کی زبان اور محاورے کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ کلام میں فارسیت کے باوجود بول چال کی زبان کا رنگ نمایاں ہے۔

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزہ بھی ہے
مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گزری
تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ یہ اتنا کارِ آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

جعفر علی حسرؔت (1734/35-1785/86) : جعفر علی حسرؔت کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ اپنے دور کے رواج کے مطابق حسرؔت نے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ دیگر شعرا کی طرح حسرت بھی دہلی سے فیض آباد پھر لکھنؤ پہنچے۔ وہ کم عمری سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ 'طوطی نامہ' جعفر علی حسرؔت کی سب سے مشہور مثنوی ہے جو تقریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جعفر کی اس مثنوی پر سحرالبیان کا خاص اثر ہے۔ حسرت کے یہاں صنائع بدائع کا بہ کثرت استعمال ہے اور خارجیت اور معاملہ بندی کا رجحان بھی زیادہ ہے۔ جو لکھنوی رنگِ سخن کی نمائندگی کرتا ہے۔

کس کس طرح سے ہم نے کیا اپنا جی نثار لیکن گئیں نہ دل سے ترے بدگمانیاں
دشمن کو بھی خدا نہ دکھاوے شبِ فراق ہجراں کی شب وہ شب ہے کہ جس کو سحر نہیں
حسرت کے دل کو بند کیا چار سو سے گھیر کیا تیری زلف میں بھی ہے قیدِ فرنگ شوخ

میر حسؔن (1740/41-1786) : ان کا نام میر غلام حسن تھا۔ میر ضاحکؔ کے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان ہرات سے منتقل ہو کر دہلی میں بس گیا تھا۔ میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت بھی پائی۔ انھوں نے بھی دہلی کی تباہی کے بعد پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلے میر ضیاؔ سے اصلاح لی پھر سوؔدا سے۔ وہ قادرالکلام شاعر تھے۔ کلیاتِ میر حسن میں غزلیات اور مثنویات کا بڑا حصّہ ہے۔ تین قصیدے بھی ہیں اور رباعیات بھی۔ 'سحرالبیان' میر حسن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ اردو کی مقبول ترین مثنوی ہے۔

سحرالبیان کے مختلف حصّے داستانوں کی مختلف کہانیوں پر مشتمل ہیں مگر میرحسن نے انھیں جس طرح پیش کیا ہے اس سے یہ نئی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اس مثنوی میں اپنے دور کی تہذیبی و سماجی اور معاشرتی فضا بہت واضح ہے۔ اس مثنوی کا حُسن اس کے اسلوبِ بیان میں ہے جو سادہ مگر دلکش ہے۔ اس میں جا بجا محاکات آفرینی اور جذبات نگاری کی بیش بہا مثالیں ملتی ہیں۔ میرحسن نے سحرالبیان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثنویاں لکھیں ہیں۔ مثنوی سحرالبیان سے چند اشعار دیکھیے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی	بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپِ غم کی شِدَّت سے پھر کانپ کانپ	اکیلی لگی رونے، منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا، نہ وہ بولنا	نہ کھانا، نہ پینا، نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا، پھر نہ اُٹھنا اُسے	محبت میں دن رات گُھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو	تو اُٹھنا اُسے کہہ کے، ہاں جی، چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے	تو کہنا، یہی ہے جو اَحوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی، بات کی	پہ، دِن کی جو پوچھی، کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے	کہا: خیر، بہتر ہے، منگوائیے

عہدِ میؔر کے کچھ اور شعرا بھی قابلِ ذکر ہیں جن میں شاہ محمدی بیدؔار (1796-1727)، شیخ قدرت اللہ قدرت (ف 1790) اور ہدایت اللہ خاں ہدایؔت (ف 1804) شامل ہیں۔

میؔر کے عہد کے قابلِ ذکر شعرا اور مختلف شعری اصناف کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس عہد کی دو اور اہم اصناف شہر آشوب اور واسوخت بھی ہیں۔ شہر آشوب شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں شعرا نے اپنے زمانے کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کا بیان کیا ہے۔ اس صنف میں شاہ حاتؔم، میؔر، سودا، قائؔم اور جعفر علی حسرؔت خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا یہ دور غیر معمولی ترقی کا دور ہے جس کا نقطۂ آغاز مرزا مظہر جانِ جاناں تھے تو نقطۂ عروج میؔر اور سوؔدا۔ اس دور تک آتے آتے اردو زبان فارسی کی محتاج نہیں رہی اور اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ہر خاص و عام کی زبان بن گئی۔ شعر و سخن کا چرچا عام ہونے لگا۔ مشاعروں کی محفلیں سجنے لگیں اور مختلف اصناف کو فروغ حاصل ہوا۔ کئی نئے اسالیب کی بنیاد پڑی جن کے نتیجے میں شعر و ادب کے نئے دبستان وجود میں آئے۔

ایک نئی شعری روایت کا آغاز — نظیرؔ اکبر آبادی کی نظم نگاری

نظیرؔ اکبر آبادی (1735/40-1830) : ان کا نام شیخ ولی محمد تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا تو اپنی والدہ کے ہمراہ اکبر آباد (آگرہ) چلے گئے۔ نظیرؔ سیلانی طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے لیے جو راہ چنی، وہ اس دور کے عام تخلیق کاروں کی راہ سے مختلف تھی۔ سیر سپاٹے، تفریح اور عوامی سروکار کی وجہ سے ان کی تخلیقی کائنات وسیع تر ہونے لگی۔ انھوں نے کبوتر بازی، کُشتی، کنکوے بازی، تیراکی یا ایسے ہی دوسرے کھیلوں میں خاص دل چسپی لی۔ ساتھ ہی بلا تفریق ہر مذہب کے تہواروں میں شامل ہوتے رہے۔ جہاں کہیں محبت کا جذبہ کار فرما ہوتا، وہ اس کا احترام کرتے۔

اسی طرزِ زندگی سے نظیرؔ کے یہاں تنوع پیدا ہوا اور شعر کہنے کے لیے نئی راہیں ہموار ہوئیں۔ نظیر نے اگر چہ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن انھیں شہرت نظم نگار کی حیثیت سے ملی۔ اپنے خاص رنگ کی وجہ سے انھیں عوامی سطح پر غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی اسی مقبولیت کے پیشِ نظر بھرت پور کے مہاراجا نے انھیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اودھ کے دربار سے بھی دعوت نامہ ملا۔ مگر وہ اپنے قلندرانہ مزاج کی وجہ سے کہیں نہیں گئے۔ آگرہ اور یہاں کا ماحول ان کے لیے سب کچھ تھا۔ اس شہر سے اپنے والہانہ رشتے کو انھوں نے ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے ؎

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے — ملّا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے — شاعر کہو، نظیرؔ کہو، آگرے کا ہے

نظیرؔ اردو کے علاوہ عربی، فارسی، برج بھاشا، اودھی اور پنجابی سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ انھوں نے عوامی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے حسبِ ضرورت الفاظ بھی وضع کیے اور انتہائی سادہ اور سلیس اسلوب میں شاعری کی۔ اُن کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ ٹھیلے والے اور خوانچے والے بھی ان سے نظمیں لکھواتے تھے۔ اُن کے یہاں میلوں ٹھیلوں، موسموں، تہواروں اور مذہبی شخصیات کے علاوہ بھوک اور مفلسی جیسے موضوعات پر بھی خاصی تعداد میں نظمیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں 'روٹی نامہ'، 'آدمی نامہ' اور 'بنجارہ نامہ' بھی بے حد مقبول ہیں۔ ان کی نظم 'آدمی نامہ' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

دنیا میں بادشا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

میؔر کے عہد کی نثر

شاعری کی طرح اردو نثر بھی شمالی ہند میں قدرے تاخیر سے وجود میں آئی۔ تعلیم یافتہ لوگ اپنے اہم تحریری کاموں کے لیے فارسی زبان کو ترجیح دیتے تھے مگر صوفیوں کے بعض اقوال اور فقروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کے کاروبار میں کسی حد تک اردو نثر کو بھی دخل تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ وغیرہ نے اپنی گفتگو میں اردو الفاظ اور فقرے استعمال کیے ہیں۔ اس کی بعض ابتدائی صورتیں میر جعفر زٹلی کے طنزیہ سیاسی اقوال میں بھی نظر آتی ہیں جن میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے جوڑ سے زٹلی نے پر مذاق فقرے اور جملے بنانے کی کوشش کی ہے۔

اردو روزمرّہ نے شمالی ہند کے بعض اہل قلم کو اس طرف راغب کیا کہ وہ رائج الوقت اردو فقروں کو اپنی تحریروں میں استعمال کریں۔ سیّد برکت اللہ عشقی بلگرامی نے صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے بہت سے اردو الفاظ و محاورات 'عوارفِ ہندی' میں استعمال کیے۔ مرزا جان طپشؔ نے دہلی دربار میں استعمال کی جانے والی متعدد اصطلاحات کا ایک ضخیم مجموعہ 'شمس البیان فی مصطلحات الہند وستان' کے نام سے مرتب کیا۔

شمالی ہند کی ابتدائی نثری کاوشوں نے اردو نثر کے تشکیلی عمل کو تیز کر دیا۔ تخلیقی اور علمی کاموں میں نئے لفظوں اور ترکیبوں کی پیوندکاری نے اردو نثر کو ایک مخصوص صورت دی۔ اس ذیل میں سیّد فضل علی فضلی کی 'کربل کتھا' (1732-33) کا نام لیا جا سکتا ہے جو فارسی تصنیف 'روضۃ الشہدا' کا اختصار سے کیا گیا اردو ترجمہ ہے۔ فضلی نے چند برسوں بعد اسے نسبتاً آسان زبان میں دوبارہ لکھا۔

اسی عہد میں معین الدین حسین علی نے تصوّف میں ایک فارسی تصنیف کا ترجمہ 'جامِ جہاں نما' (1760-61) کے نام سے کیا۔ جس کے بعد شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی نے 'خدائی نعمت' (1771) لکھی۔ یہ قرآن کے آخری پارے کی آسان زبان میں تفسیر ہے جو 'تفسیر مرادیہ' کے نام سے بھی کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ رفیع الدین نے اردو میں مکمل قرآن کا لفظی ترجمہ کیا۔ لفظی ترجمہ ہونے کی وجہ سے شاہ صاحب کی زبان رواں نہیں تھی۔ اس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے 1790-91 میں 'موضح قرآن' کے نام سے سلیس و بامحاورہ زبان میں ترجمہ فرمایا اور تفسیری حواشی بھی تحریر کیے۔ ہندوستان کے دیگر مذاہب

کے ماننے والوں نے بھی عوام میں اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے اردو نثر کو وسیلہ بنایا۔ عیسائی مشنریوں نے خاص طور پر 'انجیل' کے ترجمے اردو زبان میں کیے۔

ہندو مذہب کی بھی بہت سی کتابیں اردو نثر میں ترجمہ کی گئیں۔ سندھ کے مؤل رام نے بھگوت گیتا کا فارسی آمیز اردو ترجمہ کیا۔ ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے راماین، مہابھارت، لیلاوتی اور دھرم شاستر کے ترجمے کروائے۔ علم تاریخ میں رستم علی بجنوری کی کتاب 'قصۂ احوال روہیلہ' کی بھی اہمیت ہے۔ اس میں شجاع الدولہ کے عہد حکومت تک روہیلہ قوم کے عروج و زوال کا بیان ملتا ہے۔ افسانے اور ناول سے بہت پہلے اردو میں قصّہ کہانی کی روایت عام رہی ہے۔ شمال میں اس کی قدیم مثال عیسوی خان کی داستان 'قصّۂ مہر افروز و دلبر' ہے۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسینؔ کی داستان 'نَو طرزِ مرصّع'، مہر چند کھتری کی داستان 'نو آئینِ ہندی'، شاہ عالم ثانی (1806-1727) کی 'عجائب القصص' (1792/93) اٹھارھویں صدی میں اردو نثر کی اہم مثالیں ہیں۔ ان کا مفصّل ذکر داستانوں سے متعلق باب میں آئے گا۔